منزہ مبین
لیکچرار، ویمن یونیورسٹی، صوابی
ڈاکٹر حمیرا اشفاق
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

تعلیم نسواں کے فروغ میں نواب سکندر جہاں بیگم کی علمی و ادبی خدمات

When we look at the history of international states, we find only the state of Bhopal which was governed by four ladies of the same family for a long period of 107 years out of its total dynasty of 223 years. Starting with Fateh Bibi the wife of its founder Sardar Dost Muhammad Khan and produced by Maji Mamola, and AasmtBegum, all were having exemplary qualities of wisdom,sagacity, diplomacy,bravery and God fearing attitude.As far as theoretical and literary contribution is concerned,Nawab Sikander Jahan Begum comes on top of the list because in her era, Bhopal was so developed in culture and literature that it was being equated with Dehli and Lakhnow.Nawab Sikander Jahan Begum did make a lot of effort to empower women folk so that they can move forward in every field of life without any gender discrimination.

جب ہم ہندوستان کے حکمرانوں کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو بھوپال واحد ایسی ریاست نظر آتی ہے جس کی ۲۲۳ سالہ مدت میں ایک ہی خاندان کی چار بیگمات نے ۱۰۷ سال حکومت کی۔ ریاست بھوپال کے بانی سردار دوست محمد خاں کی شریک حیات فتح بی بی سے لے کر یکے بعد دیگرے منظر عام پر آنے والی بیگمات میں ماجی ممولا، عصمت بیگم، نواب گوہر قدسیہ بیگم، نواب سکندر جہاں بیگم وغیرہ ہیں۔ ان میں سے ہر ایک تدبر، بیدار مغزی، زمانہ شناسی، معاملہ فہمی، جرات مندی، خداترسی کے لحاظ سے اپنی مثال آپ تھی۔ انہی بیگمات میں سے اگر نواب سکندر جہاں بیگم کو ان کی ذہنی وفکری صلاحیتوں، اور ادبی کارناموں کے تناظر میں دیکھا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ ان کی شخصیت میں وہ تمام اوصاف حمیدہ اور خصوصیات یکجا تھیں جن کی بنا پر وہ اپنی فرماں روائی کو ایک قابل تقلید نمونہ اور اپنے دور حکومت کو ریاست کی تاریخ کا عہد زریں بنانے میں کامیاب ہوئیں۔ بقول نواب سلطان جہاں بیگم

''تاریخ بھوپال میں نواب سکندر جہاں بیگم کا وہی مقام ہے جو تاریخ ہند میں شہنشاہ اکبر اعظم کو حاصل ہے۔جب اکبر سریر آرائے سلطنت ہوا تھا تو ملک کی حالت نہایت نازک تھی،لیکن اس نے اپنی دور اندیشی ،اور حکمت عملی کی بدولت ملک کو اوس نازک حالت سے نکالا۔۔۔اسی طرح نواب سکندر بیگم اگر چہ ایسے زمانہ میں پیدا ہوئیں تھین اور اونہون نے اوس دور مین پرورش پائی جو تاریخ میں سب سے زیادتاریک اور ہولناک ہے۔۔۔''[1]

نواب سکندر بیگم کا عہد حکومت ۱۸۴۴ء سے ۱۸۶۸ء تک کے طویل عرصے پر محیط ہے۔یہ پہلی خاتون تھیں جن کے نام کے ساتھ ''جہاں'' کا لقب لگایا گیا۔عرفیت ان کی موتی بی بی تھی۔چنانچہ موتی محل،موتی بنگلہ،موتی مسجد سب اسی نام کی یادگاریں ہیں۔نواب سکندر جہاں بیگم نے تقریباً ۲۴ سال حکومتی فرائض سرانجام دیئے۔ان کی زندگی وقتاً فوقتاً ایسے واقعات و حادثات رونما ہوئے۔جو ایک عام انسان کی زندگی میں نسبتاً کم یا شاذ و نادر ہی نظر آتے ہیں۔عالم شیر خوارگی میں باپ کا انتقال ،خانہ جنگیوں میں پرورش پانا،اپنے آپ کو سخت خطرات میں مبتلا پانا ،اپنے حقوق سے محرومی کا احساس ،،شوہر سے ناکشیدگی،اور اپنی بیٹی کے آیندہ حقوق کی طرف سے پریشانی ،ترک پردہ ،بیوگی کے بعد ریاست سے متعلق قضیے کے خطرات وغیرہ۔ان تمام واقعات میں انہوں ہر موقع پر فہم وفراست سے کام لیا۔ملک کی خستہ حالی کو درست کیا،قومی خزانے میں اضافہ کیا۔

نواب سکندر جہاں بیگم ہندوستان کی پہلی خاتون تھیں جنھوں نے مجمع عام میں تقریریں کیں۔ہندوستانی معاشرے میں عورت ہونے کے ناطے ایسا قدم اٹھانا بہت جرات کا کام تھا لیکن اس کا مقصد اس معاشرے میں موجود دیگر خواتین کے لئے راہ ہموار کرنا تھا۔فرمانروا ہونے کے آٹھ ماہ بعد جنوری ۱۸۶۱ء میں انہوں نے سب سے پہلے جلپور کے دربار میں تقریر کی اور یہ ہندوستان میں ہندوستانیوں اور انگریزوں کے لیے ایک ہندوستانی خاتون کی تقریر سننے کا پہلا موقع تھا۔یہ تقریر وائسرائے ہند کی اس تقریر کے جواب میں تھی۔جو وائسرائے ہند نے نواب سکندر بیگم کو سند بیرسیہ عطا کرتے وقت ان کے احسانات زمانہ غدر کی شکر گزاری میں کی تھی۔اور بصلہ خیر خواہی ایک پورا پرگنہ بیرسیہ عطا ہوا۔لارڈ لینگ نے ان کو خطاب کر کے کہا:

''یور ہائنیس اس دربار میں آپ کا شریک ہونا ایک مبارک فال ہے میں آپ کی خدمات کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔آپ اس ریاست کی فرمانروا ہیں۔جس نے دولت برطانیہ کے خلاف کبھی تلوار نہیں اٹھائی۔آپ نے عورت ہو کر ایسی بہادری دکھلائی جو فی الحقیقت ایک مدبر یا ایک سپاہی کے شایان شان تھی اس لیے اس صلہ میں آپ کو سند تملیک بیرسیہ عطا کی جاتی ہے۔''[2]

نواب سکندر بیگم کی تعلیمی کوششوں کا اگر تنقیدی جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ سکولوں کا اجراء اور ان کا انتظام نواب سکندر بیگم کے عہد حکومت ۱۸۴۸ء سے شروع ہوا تھا۔اور یہ وہ زمانہ تھا کہ لڑکیوں کی تعلیم پر کسی قسم کی کوئی توجہ صرف نہیں کی جاتی تھی۔لڑکیوں کے لیے کوئی مدرسہ نہیں بنایا گیا جبکہ بعض ریاستوں میں لڑکوں

کے لیے مدرسے جاری کیے گئے تھے۔نواب سکندر جہاں بیگم تعلیم نسواں کے حوالے سے بہت تشویش کا شکار تھیں۔اس عہد کی تعلیمی صورتحال اور نواب سکندر جہاں بیگم کی کاوشوں کے حوالے سے و۔اصاحبہ لکھتی ہیں کہ

''ایسے وقت میں نواب سکندر بیگم نے بھوپال میں لڑکیوں اور لڑکوں دونوں کے لیے مدارس کا اجراء فرما کر ایک زبردست مثال قائم کر دی کہ ایک فرمانروا کو اپنی رعایا کے ہر مرد عورت کا کس طرح یکساں خیال رکھنا چاہیے۔انہوں نے نہ صرف بھوپال میں اردو ہندی کے مدرسے قائم کیے اور رعایا کو پڑھنے لکھنے کی ہر ممکن ترغیب دلائی۔'' [۳]

اس اقتباس کی روشنی میں دیکھا جائے تو نواب سکندر بیگم نے نہ صرف مدرسے قائم کیے بلکہ تمام طالب علموں جن میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں شامل ہوتے تھے، کامیاب ہونے پر ایسی کتابیں تحفتہً دی جاتیں جن سے ان میں دفتروں میں کام کرنے کی صلاحیت پیدا کرنے میں مدد ملتی تھی۔وہ کتابیں اسکول ہی میں رکھ دی جاتی تھیں اور جب انعام پانے والا انہیں پڑھ کر ختم کر لیتا تھا تو اسے ان کی قیمت کے مطابق روپے مل جاتے تھے۔اسی طرح ریاست بھوپال کے مختلف اضلاع، گاؤں اور دیہاتوں میں تعلیم کے لیے اردو، ہندی کے مدرسے اور شہروں میں عربی، فارسی، انگریزی اور دستکاری و صنعتی تعلیم کے مدرسے جاری کیے تھے۔

''اس دور میں علم کے حصول کے لیے مخصوص نصاب تھا جسے حاصل کرنا ہر کس و ناکس کے بس میں نہیں تھا۔ذہین و فطین طلبہ ہی اس علم کی تکمیلی مراحل تک پہنچتے تھے۔خواتین کے لیے باقاعدہ نصاب مقرر نہیں تھا کیونکہ اس زمانے میں تعلیم نسواں کا رواج نہیں تھا۔چند گھرانوں میں تعلیم نسواں پر توجہ دی گئی، جہاں لڑکیاں فارسی زبان و ادب بھی مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ پڑھتی تھیں۔'' [۴]

علاوہ ازیں اس دور میں مانیٹری کا عہدہ بطور اعزاز دیا جاتا تھا لیکن نواب سکندر جہاں بیگم نے اس کی بھی باقاعدہ ماہوار تنخواہ رکھی تھی۔لڑکیوں کو دو روپے اور لڑکوں کو تین روپے ماہوار ملتے تھے۔جس وقت طلباء اسکول کی تعلیم سے فارغ ہو جاتے اور جن کے اچھے نمبر آتے تھے تو وہ سرکاری دفتروں اور محکموں میں بطور امیدوار رکھ لیے جاتے اور موقع کی مناسبت سے انہیں معقول ملازمتیں دی جاتی تھیں۔یتیم لاوارث اور غریب بچیوں کے لیے کوئین وکٹوریا کے نام پر وکٹوریا اسکول قائم کیا گیا۔جس میں پڑھائی کے علاوہ دستکاری پر بھی خصوصی توجہ صرف کی جاتی۔ علاوہ ازیں سوزن کاری بلکہ کھانے پینے کی اشیاء کا تیار کرنا وغیرہ بھی سکھایا جاتا تھا۔اس سکول کی لڑکیوں کے ہاتھ کی چیزیں نواب سکندر بیگم وائسرائے اور اکثر یورپین لیڈیوں کو تحفتہً بھیجا کرتی تھیں۔اور کبھی عمائد ریاست کو بھی عنایت فرماتی تھیں اور سالگرہ کے موقع پر حضور کوئین وکٹوریا اور شہزادی ویلز کو بھی انہوں نے یہی تحفے ارسال کیے۔بقول و۔اصاحبہ

''سفر حج سے واپسی پر ترکی لباس کا نمونہ اپنے ہمراہ لائیں اور وہی لباس اس اسکول کی وردی قرار

دیا گیا تھا۔مدرسے کی نگرانی بہت سخت کی جاتی تھی۔لڑکے لڑکیاں اکثر ڈیوڑھی پر حاضر ہوتے تھے،اور وہاں ان کی قابلیت اور ہنرمندی کا امتحان لیا جاتا۔نواب شاہجہاں بیگم اور نواب سلطان جہاں بیگم ہفتے میں ایک ایک دن خود جا کر اسکول کا معائنہ کرتی تھیں۔''[۵]

سکول کے طالب علموں کی شادیاں بھی نواب سکندر بیگم خود اپنی ذمہ داری سمجھ کر کرواتی اور اس فرض کی ادائیگی کے سلسلے میں تمام اخراجات ریاست بھوپال کے فرائض میں شامل تھے۔طلباء کی حاضری پر غیر معمولی توجہ دی جاتی،سرکاری کاغذات کی طرح ملاحظے میں طلباء کی حاضری رجسٹرڈ پیش کیے جاتے تھے۔طالب علموں میں شوق پیدا کرنے کی کوششوں کے علاوہ مدرسوں کو بھی مالی معاونت عطا کر کے ان کا حوصلہ بڑھایا جاتا تھا کہ وہ رعایا کی تعلیم میں دل لگا کر محنت کریں۔ریاست بھوپال کے قریب ضلع ساگر تھا۔نواب سکندر جہاں بیگم نے ساگر کا دورہ کیا اور مدارس کا بھی معائنہ کیا۔یہاں انگریزی کا جدید مدرسہ قائم ہوا تھا۔اس کے کامیاب طلبہ کو ضمناً ۵۰۰ انعام عطا کیا۔اسی طرح سیہور کا مدرسہ بہت چھوٹا تھا۔عمارت بھی اچھی نہ تھی۔۱۸۵۰ء میں نواب سکندر بیگم نے اس کی نہایت خوش نما عمارت بنوائی۔نواب منیر محمد خاں صاحب بہادر مرحوم جو نواب جہانگیر محمد خاں صاحب بہادر مرحوم کے بڑے بھائی تھے۔اپنی جاگیر سے سالانہ اس مدرسے کو دیا کرتے تھے چونکہ ان کے انتقال کے بعد جاگیر شامل خالصہ ہوگئی اور زر سالانہ بھی بند ہوگیا۔چونکہ علمی کام تھا نواب بیگم کی بلند ہمتی نے گوارانہ کیا کہ جو رقم اس جائیداد سے اشاعت تعلیم کے لیے جاری ہو چکی تھی،بند کر دی جائے۔اس لیے بغیر کسی تحریک کے خود نواب صاحب پولیٹیکل ایجنٹ کو لکھ کر خزانہ ریاست سے عطیہ جاری کر دیا تھا۔

نواب سکندر جہاں بیگم نے نہ صرف حکومتی سطح پر تعلیم نسواں کے فروغ کی خدمات سرانجام دیں بلکہ ان کی تصنیفات بھی اسی مقصد کی غماز ہیں۔مذہبی علوم خاص کر فقہ تصوف اور معرفت کی کتابوں سے ان کو خصوصی لگاؤ تھا۔دوسرے مذاہب کی کتابیں بھی شوق سے دیکھتیں،''سریمد بھاگوت گیتا''ہندوؤں کی مشہور کتاب اور توریت وانجیل کے ترجموں کا بہت غور سے مطالعہ فرمایا تھا۔اور ان کا حال بھی انہوں نے اپنے روزنامچے میں لکھا ہے۔مذہبی کتابوں سے علاوہ اخلاقی تمدنی تاریخی اور جغرافیے کی کتابیں بھی دلچسپی سے پڑھیں۔اور یہ شوق یہاں تک ترقی کر گیا کہ باوجود کاروبار ریاست کی مصروفیت کے اخیر زمانے میں انگریزی پڑھنی شروع کی تھی۔بقول و۔اصاحبہ

''مکہ معظّمہ میں قیام کے دوران انہوں نے یہ بھی کوشش کی تھی کہ قرآن مجید کے احکام میں سے لے کر ایک ایسا مجموعہ تیار کرائیں،جس میں انتظام ملک کے سارے اہم امور آجائیں۔اس کوشش میں انہوں نے خود بھی بہت کچھ محنت کی اور کتاب کی تکمیل کے لیے مولوی عبدالقیوم صاحب کو مامور کیا۔جس وقت وہ مکمل ہوگئی تو مولوی شاہ حسین صاحب بخاری جو ایک جید عالم تھے،اس کے تبصرے اور تنقید پر مقرر کیے گئے۔''[۶]

مکہ معظّمہ ہی کے قیام کے زمانے میں ترکوں کی اخلاقی حالت دیکھ کر انہوں نے یہ بھی تجویز کی تھی کہ قرآن مجید کا ترکی زبان میں ترجمہ کیا جائے۔ یہ لوگ مذہبی احکام سے بے خبر ہیں،اسی لیے اس پر عمل نہیں کرتے اور انہوں نے شیخ احمد صاحب احمد داغستانی سے جو ایک زبردست عالم تھے اور ترکی بہت عمدہ جانتے تھے،اس مسئلہ پر گفتگو کر کے انہیں اس کام پر آمادہ کر لیا۔ داغستانی صاحب نے اپنے وعدہ کے مطابق وہ ترجمہ کر کے سب سکندر بیگم کے پاس بھیج دیا تھا۔ جس کے صلہ میں داغستانی صاحب کو چار ہزار روپیہ نقد اور قیمتی تحفے دیئے گئے لیکن قدرت نے اس کے شائع ہونے کی مہلت نہ دی۔ افسوس کہ آج اس ترجمے کا ایک مسودہ بھی موجود نہیں ہے۔

اسی سلسلے میں نواب سکندر بیگم کا یہ کارنامہ بھی ہے کہ عام مسلمانوں کے لیے انہوں نے مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی رحمتہ اللہ علیہ کی تفسیر ''فتح العزیز'' کو مکمل کرانے کی طرف توجہ صرف کی۔ انہوں نے اس کی تکمیل کے لیے مولوی حیدر علی لکھنوی مولف منتہی الکلام کو جو شاہ صاحب کے شاگردوں میں سے ایک بڑے جید عالم ،متکلم اور مناظر تھے۔ پانچ سو روپے ماہوار پر مقرر کیا۔ اور چند علما ان کی امداد کے لیے تعین کیے۔ چنانچہ کئی سال کی محنت میں کتاب ''والمصنات'' کی چار ضخیم جلدیں تیار ہوئیں۔ مگر اس کے بعد مولانا دکن چلے گئے اور تفسیر ناتمام رہ گئی۔ یہ چاروں جلدیں ندوۃ العلما کے کتب خانہ میں موجود ہیں۔ نواب سکندر جہاں بیگم کی انہی کاوشوں کے متعلق عارف عزیز لکھتے ہیں کہ

> ''نواب سکندر جہاں بیگم نے بھوپال میں دفتر تاریخ کے ساتھ ۱۸۵۱ء میں ''مطبع سکندری'' کے نام سے ایک بڑا چھاپہ خانہ قائم کیا،دفتر تاریخ درحقیقت علم و ادب کی ایک اکیڈمی کی ابتداء تھی۔ ان کے دور کے اہم شعرا و ادبا میں امجد علی اشہری،مولانا رفعت عباس شیروانی،مولوی جمال الدین گمنام،قدرت اللہ بنارسی،عبدالحمید عاجز،عبدالعلی تونگر،وغیرہ چند قابل ذکر نام ہیں۔''[۷]

نواب سکندر بیگم میں تصنیف و تالیف کی قابلیت بھی موجود تھی۔ جو 'تاریخ سکندری' کے دیکھنے سے اچھی طرح ظاہر ہوتی ہے۔ انہوں نے اسے مینجر ڈیور ینڈ رینڈ پولیٹکل ایجنٹ کی تحریک سے 'تزک بابری' کے طرز پر مرتب کرایا تھا۔ اور بانی ریاست کے زمانے سے حالات و واقعات کی جستجو کی لیکن مشکل یہ تھی کہ گذشتہ زمانے کے کاغذات موجود نہ تھے۔ صرف کچھ تھوڑے سے نواب قدسیہ بیگم کی ڈیوڑھی سے مل سکے۔ غرض کاغذات کے لحاظ سے صرف وہی سرمایہ موجو تھا جو نواب قدسیہ بیگم کے ہاں سے ملا۔ پھر معمر اور سن رسیدہ آدمیوں کو تلاش کر کے جہاں تک ممکن ہوا۔ مولوی صدیق حسن خان صاحب کو ترتیب پر مامور کیا اور کام جاری ہو گیا۔ جیسے جیسے مسودات تیار ہوتے گئے پیش کیے جاتے رہے اور وقتاً فوقتاً ہدایات کے مطابق درست کیے جاتے رہے تھے۔ چنانچہ ان کی ہدایت ونگرانی کا اندازہ ذیل میں کی گئی گفتگو سے ہو جاتا ہے بقول و۔ اصاحبہ

> ''فصل پہلی تاریخ بھوپال کی جو ہمہ جہت تیار کر کے آپ نے دی ہے،اس کی مثل خام مقدمہ وار

نہیں ہے۔کچھ حال اس کا تصنیف دیانت رائے سے لکھا گیا ہے اور کچھ تاریخ مطبوعہ گلشن آباد عرف جاورہ سے۔۔۔فارسی سلیس اور مختصر میں مطابق محاورہ ایران کے نہیں لکھی گئی ہے۔۔۔''[۸]

یوں پھر نواب سکندر بیگم کے زیر نگرانی اس کتاب کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ سردار دوست محمد خاں کے زمانے سے نواب نظر محمد خاں کے انتقال تک

۲۔ نواب نظر محمد خاں کے انتقال سے نواب بیگم کی مختاری ریاست تک

۳۔ حالات زمانہ مختاری نواب بیگم

۴۔ حالات صدر نشینی نواب بیگم

زیر نظر کتاب ۱۸۸۱ء تک کافی حد تک مرتب ہو چکی تھی۔لیکن صرف پہلا حصہ 'تاریخ سکندری' کے نام سے طبع ہو سکا اور باقی حصے رہ گئے تھے۔مگر بعد میں نواب شاہجہاں بیگم نے اپنے زمانے کے حالات اس میں اضافہ کر کے ''تاج الاقبال'' کے نام سے طبع کرا دیا۔مگر اس کتاب میں نواب سکندر بیگم کے حالات بہت ہی کم ہیں کیونکہ وہ ایک تاریخ ہے۔

اسی طرح جب نواب سکندر بیگم نے حج کا ارادہ کیا تو میجر ڈیورینڈ اور ان کی بیگم صاحبہ نے ان سے اپنا سفر نامہ لکھنے کی بھی درخواست کی۔چنانچہ حج سے واپسی پر یہ سفر نامہ 'سفر حجاز' کے نام سے مرتب ہوا۔اس سفر نامہ کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس اہم اور مقدس سفر میں ہر چیز کو بغور نظر دیکھا۔آب و ہوا،موسمی حالات،صحت،تمدن،معاشرت،سلیقہ،طرز تعمیر،آرائش و زیبائش،مکانات،طرز آبادی،تجارت،قومی حالت وغیرہ سب پر مختصر بحث کی ہے۔یہ سفر نامہ ان کی زندگی میں تو نہیں چھپ سکا۔لیکن بعد میں نواب شاہجہاں بیگم نے انگریزی میں ترجمہ کرا کے شائع کر دیا۔اور کوئین وکٹوریا کے نام کے ساتھ اس کا ہدیہ کیا گیا۔اس سفر نامہ کے بارے میں سلیم حامد رضوی نے گارساں دتاسی کے حوالے سے لکھا ہے کہ

''آپ صاحبوں کو یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اردو ادب کی ترقی کی رفتار سست ہو گئی ہے نہ صرف اردو جرائد کی تعداد ہندی جرائد کے مقابلے میں زیادہ ہے بلکہ دوسری مطبوعات بھی اردو میں زیادہ تعداد میں شائع ہوتی ہیں۔مثال کے طور پر بیگم صاحبہ بھوپال نے اپنے سفر حجاز کے حالات اردو میں لکھے ہیں۔''[۹]

ان کتابوں کے علاوہ ایک اور مجموعہ 'آئین سکندری' ہے۔اس میں مذہبی اخلاقی اور سیاسی نصیحتیں فرماں روا کے فرائض،عمال کی نگرانی،مخلوق الٰہی کا تحفظ وغیرہ جو مختلف بزرگوں کی تصنیفات سے لی گئی ہیں۔چنانچہ وہ خود بھی ان ہدایتوں پر کاربند رہیں اور چاہتی تھیں ان کے جانشین بھی انہی اصولوں کے پابند رہیں۔۱۸۴۷ء میں جب سکندر بیگم اور میاں فوجدار محمد خاں ریجنٹ کی حیثیت سے بغیر کسی اشتراک حکومتی نظم و نسق چلاتے تھے:

''اس وقت نواب سکندر بیگم نے کچھ اصول و آئین وضع کئے اور ان کا نام آئین سکندری رکھا اور اپنی حکومت کے زمانہ میں ان ہی اصولوں کے ساتھ حکومت کی ۔(آئین سکندری کو کتاب کی شکل میں نواب سلطان جہاں نے طبع کروا دیا جس میں نصیحتوں کے طور صاحبان حکومت کو حکومت کرنے کے طریقے بتلائے ۔''[۱۰]

مندرجہ بالا اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ ایک مورخ کی حیثیت سے تاریخ نگاری کے فرض کو کس خوش اسلوبی سے انجام دیا گیا ہے۔ چنانچہ اس کتاب کا ایک حصہ فارسی میں' تاریخ سکندری' کے نام سے شائع ہوا۔اس کتاب کی اشاعت کے حوالے سے نواب سلطان جہاں بیگم نے ان خیالات کا اظہار کیا ہے کہ

''چونکہ اس زمانہ میں فارسی زبان سے بالکل اجنبیت اور بیگانگی ہوتی جارہی ہے اس لئے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ ساتھ ہی ساتھ اس کا ترجمہ بھی شائع کیا جائے چنانچہ دفتر تاریخ کے ایک اہلکار منشی محمد عبدالوحید نے اس کا ترجمہ کیا اور اصل متن کی تصحیح اور ترجمہ پر نظر ثانی مولوی محمد عبدالرزاق صاحب منتظم تاریخ نے کی ہے۔''[۱۲]

نواب سکندر بیگم جس طرح فارسی زبان میں لگاؤ اور دلچسپی رکھتی تھیں اسی طرح اردو کی بھی جو ابھی بالکل ابتدائی حالت میں تھی قدر دان تھیں۔ایک مرتبہ سیر و سیاحت کے سلسلے میں لکھنو تشریف لے گئیں تو مرزا رجب علی بیگ سرور کو بلایا جو اس زمانے کے مشہور انشا پرداز تھے۔اور ان سے ایک قصہ لکھنے کو اصرار کے ساتھ فرمائش کی تھی۔ قصے کا مضمون یہ تھا کہ بھوپال کے کسی امیر نے ایک نر سارس کا شکار کیا تھا اور اس کی مادہ اس کے لیے کڑھ کڑھ کر مر گئی تھی۔وقت بہت کم تھا اور فرمائش یہ تھی کہ جلد لکھا جائے۔مرزا صاحب نے 'فسانہ عجائب' کے انداز پر روانگی سے پہلے ہی قصہ لکھ کر پیش کر دیا۔جس کے صلے میں خلعت اور پانچ سو روپے انعام پیش کیا گیا۔ یہ قصہ 'شرار عشق' کے نام سے لکھنو میں چھپ چکا ہے۔ بقول سلطان جہاں بیگم

''اگر چہ وہ خود عالم نہ تھیں مگر علم کی قدر دان تھیں اور باوجود عدیم الفرصتی اور فرائض حکومت کے وقت کا کچھ حصہ مطالعہ کتب کے لئے وقف تھا اور ان کے مطالعہ مین میں مذہبی و اخلاقی کتابیں زیادہ رہتی تھیں ۔۔۔لٹریچر کے ساتھ خاص ذوق پیدا ہو گیا ان کی علمی ذوق اور مسٹر جوزف ڈوی کنگھم کی ترغیب نے ان کو تاریخ بھوپال کی ترتیب و تدوین پر آمادہ کیا۔''[۱۳]

نواب سکندر بیگم کی علمی اور تعلیمی کوششیں بھوپال ہی تک محدود نہیں تھیں بلکہ بھوپال سے باہر بھی انہیں تعلیم کی اشاعت میں دلچسپی تھی اس مقصد کے لیے جدو جہد کرتی تھیں اور ان کی امداد فرماتی تھیں۔سکندر بیگم نے ہندوستان کے اندر اردو کو بین الاقوامی اور ترقی پزیر زبان سمجھتے ہوئے بجائے فارسی کے اردو کو رواج دیا۔ گورنمنٹ کا بھی تقاضا یہی تھا کہ فارسی کے بجائے انگلش یا مقامی زبان کو فروغ اور ترقی دینا تھا۔نواب سکندر

بیگم کوعلم سے ذاتی شغف تھا۔اہل ہنر کی دل سے قدر دانی کرتی تھیں۔ان کوخود بھی تصنیف و تالیف کا ذوق تھا۔ریاست میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری تھا۔ہندوستان میں سب سے پہلے انہوں نے ۱۸۵۹ء میں بھوپال میں اردو کوسرکاری زبان قرار دیا۔ڈاکٹرسلیم حامد رضوی کا کہنا ہے کہ

''فارسی کی استعداد اچھی تھی لیکن وہ فارسی میں بہت کم لکھتی تھیں۔البتہ اردو زباپر ان کو بڑی قدرت حاصل تھی۔تمام خطوط اور سرکاری مراسلت اردو میں ہی کیا کرتی تھیں۔۔۔''[۱۴]

فوجدار محمد خاں جونواب سندر بیگم کے ماموں تھے ان کو غالب نے اپنا دیوان اپنے قلم سے تصحیح کر کے بھیجا تھا جو بعد میں نسخہ حمیدیہ کے نام سے منظر عام پر آیا۔نواب سکندر بیگم نے ۱۸۵۷ء میں غالب کو بھوپال آنے کی دعوت دی اور کل مصارف کی ذمہ داری ہے۔مگر غالب نے دہلی نہ چھوڑنے کا عذر کیا۔نواب سکندر بیگم جہاں بھی سفر پر جاتی تھیں، وہاں کے چند علماء وفضلاء کو بھوپال لانے کا کام انجام دیتی تھیں۔وہ سفر حج سے واپسی میں یمن سے شیخ زین العابدین کو بھوپال لائیں۔شیخ المحدثین شاہ عبد القیوم محدث دہلوی کو دعوت دے کر بھوپال بلایا۔سرسید احمد خاں کی اشاعت تعلیم کی کوششوں کونواب سکندر بیگم نے نہایت قدر وعزت کی نگاہ سے دیکھا۔اور جون ۱۸۶۶ء میں ان کو اظہار خوشنودی کے طور پر الماس کی ایک انگوٹھی بھیجی جس کی قیمت ایک ہزار روپیہ تھی۔نواب سکندر بیگم کے عہد میں بھوپال کے ادب پر دہلویت کے اثرات بہت نمایاں نظر آتے ہیں۔فرمارواؤں کی سرپرستی کی بدولت قصیدہ کی طرف خصوصی توجہ کی گئی۔اعلی اور معیاری مثنویاں بھی لکھی گئیں۔بقول ڈاکٹرسلیم حامد رضوی

''غزل میں دہلوی متانت،سنجیدگی، پاکیزگی اور جذبات کی گہرائی کے ساتھ ناسخ اور آتش کا فنکارانہ شاعری کی تقلید کا رجحان بھی ملتا ہے مگر بیگمات کی فرمانروائی کے اثرات کی بدولت یہاں کی غزل میں ابتذال،عریانی اور بے حیائی کا رنگ مطلق پیدانہیں ہوسکا۔اس دور میں استادی اور شاگردی کا سلسلہ بھی عام ہوگیا تھا اور مشاعرے بھی بکثرت ہونے لگے تھے۔''[۱۶]

نواب سلطان جہاں بیگم زندگی کے ۵۲ سال، گوناگوں خطرات اورزمانہ کی نیرنگیوں کا کامیابیوں کے طلاطم کا کامیابی سے مقابلہ کرتے ہوئے ۳۰ اکتوبر ۱۸۶۸ء کواس جہاں فانی سے رخصت ہوگئیں۔ان کے انتقال کوا یک عظیم صدمہ محسوس کیا گیا۔گورنمنٹ آف انڈیا نے غیرمعمولی گزٹ کے ذریعے سے اپنے رنج و ملال کا اظہار اوران کی قابلیت کا اعتراف کیا۔ہندوستان وانگلستان کے تمام اخبارات نے غم والم کے ساتھ یہ خبر شائع کی۔ان کی فہم وفراست اور سوانح کے حوالے سے بڑے بڑے کالم لکھے گئے جن کو اقتباساً بھی اگر لکھا جائے تو بھی ایک ضخیم کتاب تیار ہوسکتی ہے۔نواب سلطان جہاں بیگم نے آئین سکندری میں لکھا ہے کہ

''خلدنشین نواب سکندر بیگم صاحبہ فرمانروائے بھوپال ان خواتین مین تھیں،جن کی زندگی تاریخ

عالم نسواں کی زیب و زینت ہے۔ان کے دور حیات میں جو گونا گوں انقلاب پیش آئے اور ان مین انہوں نے جس عزم،استقلال ،فراست اور بیداری کا ثبوت دیا۔۔۔اٹھارویں صدی عیسوی کے پر آشوب زمانہ اور ایک ایسے غیر متمدن ملک مین جہاں آثار مدنیت کو مٹے ہوئے صدیان گزر چکی تھیں ان کے ہاتھوں عظیم الشان کام سرانجام پائیں''[۱۵]

ان کے ہم عصروں میں سے کسی فرد نے بھی ان جیسی معاملہ فہمی،فہم وفراست اور صبر واستقامت کے بل بوتے پر وہ عروج حاصل نہ کیا جو نواب سکندر جہاں بیگم کو نصیب ہوا۔دیگر خوبیوں کے علاوہ ایک نمایاں صفت جو ہمیں ان کے ہاں بحثیت خاتون حکمران کے دکھائی دیتی ہیں وہ قوت و طاقت ہے۔اور اسی کی بناء پر ان کی ریاست کا نظم ونسق قومی بنیادوں پر قائم تھا۔جس کا ہر پہلوان کی الوالعزمی کا منہ بولتا ثبوت تھا۔سکندر بیگم ایک حلیم اور مستقل مزاج خاتون اور پاسِ عزت میں اپنی مثال آپ تھیں۔تاریخ میں مرد حکمرانوں میں کچھ قابل اور بہت سے نااہل ثابت ہوئے ہیں۔مگر عورتیں جو حکمران ہوئی ہیں،ہمیشہ ہی قابل فخر حکمران شمار ہوئی ہیں۔نواب سکندر جہاں بیگم کی زندگی ہر عہد کی خواتین کے لیے عمدہ نمونہ ہے۔جس کا بین ثبوت ہمیں نواب سکندر جہاں بیگم کی صورت میں ملتا ہے۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ نواب سلطان جہاں بیگم،تزک سلطانی (حصہ اول)،مطبع سلطانی بھوپال،۱۳۲۸ھ،ص ۹

۲۔ طیبہ بی،تاریخ فرمار وایان بھوپال،موتی مسجد محل،۱۹۷۷ء،ص ۹۰

۳۔ و۔اصاحبہ،تذکرہ بیگمات بھوپال،۱۹۳۳ء،دارالاشاعت پنجاب،لاہور،ص ۱۳

۴۔ سلطان شاہ،بیگمات بھوپال،مشرق۔پشاور/اسلام آباد۔منگل،۳۰ اگست ۲۰۱۶

۵۔ و۔اصاحبہ،تذکرہ بیگمات بھوپال،۱۹۳۳ء،دارالاشاعت پنجاب،لاہور،ص ۲۵

۶۔ و۔اصاحبہ،تذکرہ بیگمات بھوپال،۱۹۳۳ء،دارالاشاعت پنجاب،لاہور،ص ۲۶

۷۔ اطہر صدیقی،نواب سلطان جہاں بیگم حیات و خدمات، عارف عزیز،والیان ریاست بھوپال کی علمی وادبی خدمات،فیمیل ایجوکیشن ایسوسی ایشن علی گڑھ،نئی دہلی،۲۰۱۳ء،ص ۱۳۲

۸۔ و۔اصاحبہ،تذکرہ بیگمات بھوپال،۱۹۳۳ء،دارالاشاعت پنجاب،لاہور،ص ۲۳

۹۔ سلیم حامد رضوی،ڈاکٹر،اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ ،فائن آفیسٹ پریس ،دہلی،۲۰۱۴،ص ۱۷۵

۱۰۔ طیبہ بی،تاریخ فرمار وایان بھوپال،موتی مسجد محل،۱۹۷۷ء،ص ۹۹

۱۱۔ نواب سلطان جہاں بیگم، آئین سکندری، مطبع بھوپال، سن ن، ص ر

۱۲۔ ایضاً، ص ب

۱۳۔ سلیم حامد رضوی، ڈاکٹر، اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ، فائن آفیسٹ پریس، دہلی، ۲۰۱۴، ص ۱۷۴

۱۴۔ نواب سلطان جہاں بیگم، آئین سکندری، مطبع بھوپال، سن ن، ص ا

۱۵۔ سلیم حامد رضوی، ڈاکٹر، اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ، فائن آفیسٹ پریس، دہلی، ۲۰۱۴، ص ۷۶